خیابان خزاں ۲۰۲۳ء

# تنقیدی منظر نامہ اور دیویندر اسرؔ کی تنقیدی جہات

ڈاکٹر محمد ارشد (کامران)، ایچ ای سی، پی سی ڈی نمبر:۲۲۹۵۵، اسلام آباد

email: mkamran@hec.gov.pk

## ABSTRACT

Aptitude of distinguishing good and bad embedded in mind of every conscious person, reflects in critic experts' views as well who with biasness free perception, quench their thirst of research by persuading the best literature. Such positive activity determines that 'literature and critics' and 'literature and society' are meticulously interrelated. The critic concept under reference, based on solid grounds, divided in manifold dimension, is also visible in Devender Issr's literary thoughts who evaluates human life based literature through psychologist's point of view and closely observes the literary future by using scientist lenses. Moreover, while playing criticizer's role, he deeply analysis the past and present of Urdu literature, which kept him worried about dusky future of our literary horizon. Devendr Issr's critic, defined by some Western experts, is called alternative or choice based critic i.e. "Eclecticism". In perspective of contemporary disrespect and worthlessness of our Urdu literature, Devendre Issr has always tried his best for the significance of Urdu literature as it was inevitable to liberate it from the Western critic siege because till existence of European literature critic manacles, the shadow of Western colonial literary control was enough to play its negative role to demoralize Urdu literature. In presence of Urdu language own diversified and broad arena, he proposed that for achieving dominance instead of existing inferiority complex, Urdu literature should stop bowing down to Western critic guidance.

***Keywords:*** 1). Aptitude, 2). Distinguishing, 3). Embedded, 4). Meticulously, 5). Manifold, 6). Eclecticism, 7).Contemporary, 8). Siege, 9). Manacles,10). Diversified.

کلیدی الفاظ: ۱)۔ قابلیت، استعداد، ۲)۔ ممتاز کرنا، نمایاں کرنا، ۳)۔گھرا ہونا، پوشیدہ ہونا، ۴)۔ محتاط طور پر، باریک بینی سے ۵)۔ متعدد، ۶)۔ انتخابیت، چناؤ، ۷)۔ ہم عصر، معاصر، ۸)۔ حصار، نرغہ، ۹)۔ ہتھکڑی، بیڑی، ۱۰)۔ متنوع۔

ادب اور معاشرت کے باہمی ربط کی طرح نہ صرف ادب اور تنقید کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے بلکہ تنقید، ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے گہرے تعلق کی کڑیاں ہمارے معاشرے کو بھی باہم پروئے رکھتی ہیں۔ لغوی اعتبار سے فصیح عربی الفاظ 'نقد و تنقید' عربی اور اردو لغتِ ادب، دونوں میں مستعمل ہیں۔ بقولِ پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحق یوسفزئی:

> "نقد کے دو مفہوم ہیں، ایک لغوی اور دوسرا اصطلاحی، لغت کے اعتبار سے نقد 'کھوٹے سکوں کو کھرے سکوں سے علیحدہ کرنا' اور ادب کی اصطلاح میں نقد 'ادبی اقتباس، قطعہ (پیراگراف) کو مختلف زاویوں سے جانچنا، اس کی ادبی اور فنی حیثیت متعین کرنا ہے'۔ نقد کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں ناقد کے ایجابی اور سلبی (Positive/negative) دونوں پہلوؤں کو مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ نقد میں چیز کی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔۔۔ لیکن ہمارے ہاں نقد کے مفہوم کو سلبی پہلو سے ہی وابستہ کر دیا گیا ہے اور اس کو انگریزی کے لفظ (Criticism) اور یونانی لفظ (Kritikor) کا ہم معنی سمجھا جانے لگا۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اردو ادب میں تنقید نگاری کے فن نے مغربی ادب اور خاص طور پر انگریزی ادب کے سائے میں جنم لیا"۔[۱]

باشعور انسان کے ذہن میں سمائی بہتر سے بہتر کی جستجو اور اچھے برے کی تمیز کے احساس کی طرح تنقید نگار کی فطرت میں بھی بہترین ادب تک رسائی کی حس ہمہ وقت سوار رہتی ہے جو اسے فن پارے کی باریکیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیتوں کا مالک بنا کر متعصب روّیوں سے پاک زاویۂ نظر عطا کرتی ہے جس سے وہ اپنے تنقیدی شعور کی بدولت ادبی افق پر امتیازی مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ تنقید نگار کو اپنے درست تنقیدی نتائج کے حصول میں، فن پارے کی گہرائی و گیرائی اور باریکیوں سے کامل آگاہی کے علاوہ تخلیق کار کے ماحول اور اس کے عہد کا جائزہ لینے کے لیے دیگر علوم سے بھی استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ تنقید کی تخلیقی منزل تک رسائی کے ضمن میں صدیق کلیم کہتے ہیں:

> ''تنقید اس وقت تخلیقی مقام حاصل کر سکتی ہے جب وہ نقاد کی پوری شخصیت کا تجربہ یا ردّ عمل ہو۔۔۔ جو تنقیدی زہد و ریاضت کی تمام منازل سے گزر کر تشکیل پائے۔'' [۲]

**اردو ادب کا تنقیدی منظر نامہ:**

اردو تنقید کا نقشِ اوّلین میر تقی میر کے 'نکات الشعرا' میں عکس انداز ہوا تھا جس کے بعد میر حسن، مصحفی اور شیفتہ کے تذکروں کا نمبر آتا ہے۔ چاروں تذکرہ نگار، نامور شعرا ہونے کے علاوہ بہترین تنقید نگار بھی ثابت ہوئے بلکہ شیفتہ کے تنقیدی وار سے ہی غالب جیسے معروف شاعر بھی اپنی مشکل گوئی ترک کرنے پر مائل ہوئے تھے۔ جدید تنقید کا آغاز الطاف حسین حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' مطبوعہ ۱۸۹۳ء سے ہوا جس کے بعد یہ سلسلہ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' سے ہوتا ہوا نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، اور 'ترقی پسند ادب' کے خالق علی سردار جعفری تک آ پہنچا۔ پاکستانی تنقید نگاروں، شاعروں اور ناول نگاروں کی فہرست میں علامہ محمد اقبال، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، عابد علی عابد، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، فیض احمد فیض، انتظار حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، ساقی

فاروقی،ڈاکٹر آغا سہیل،جیلانی کامران، انیس ناگی، سجاد باقر رضوی، عرش صدیقی، احمد ندیم قاسمی،ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ وغیرہ شامل ہیں۔ شاعروں اور ناول نگاروں کی تنقیدی صلاحیتوں کے ضمن میں سلیم اختر کا کہنا ہے:

تنقید اور تخلیق کے باہمی ربط کے ضمن میں پال ڈی مانؔ نے "Blindness & Insight" میں بڑے پتے کی بات کی ہے کہ:

> ”شعرا اور ناول نگاروں کا تنقید لکھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ۔ فرانسیسی
> ادب میں بودلیئرؔ سے سارترؔ تک، جن میں ملارمےؔ اور ویلریؔ بھی شامل ہیں
> ۔۔۔جو شاعر اور ناول نگار ہونے کے باوجود تنقید لکھتے تھے۔“۳

تخلیق کار کی تنقیدی شعوری حس کی آبیاری میں دیگر عوامل کے علاوہ اساتذہ کے زاویۂ فکر کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ دیویندر اسّر کا تنقیدی شعور بھی اساتذہ کی تربیت کی بدولت اس انداز سے پروان چڑھا کہ ادبی اقدار کی پاسداری میں وہ اپنی ذات پر تنقیدی وار سے بھی باز نہ آئے، جس کی مثال ان کی ذاتی فنِ افسانہ سے متعلق ایک سے زائد مرتبہ دوہرائی گئی سفاکانہ رائے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ:

> ”میں پچھلے پچیس تیس سال سے ایک ہی افسانہ لکھ رہا ہوں“۔۴

مذکورہ رائے، دیویندر اسّر کا ناگزیر سچائیوں کو گرفت میں لیے تنقید و اصلاح کی مخصوص تڑپ کا اظہاریہ ہے۔ دیویندر اسّر، کیمبل پور (اٹک) سے ابتدائی تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد ۱۹۴۷ء میں بی اے کا امتحان دیتے ہی پاکستان سے ہجرت کرتے ہوئے کانپور (بھارت) جا کر اپنے فلسفے کے استاد پروفیسر اجمل کی ہدایت "There is always a room at top" کی پیروی میں تعلیمی، ادبی و سماجی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ نئے وطن کی نئی معاشرت میں ان کے لیے اپنی جاندار شناخت اور شاندار مستقبل کے حصول کی مثبت فکر کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے جدّت ((Innovation کے اصول اپنانا ضروری تھا ، جس کا واحد حل انھیں جدید علوم کے حصول اور نئے نظریات سے کامل شناسائی ہی میں نظر آیا۔ جدید عالمی انگریزی ادب کے کثرتِ مطالعہ کی بدولت وہ وسعت النظری، جدید تنقیدی شعور اور تخلیقی بصیرت

کے ہتھیار سے پہلے ہی سے لیس تھے ، ساتھ ہی اردو، پنجابی اور ہندی ادب کا ورتارا ان کی تخلیقی وادبی صلاحیتوں میں مزید نکھار لے آیا۔ ان کے تنقیدی و ادبی رجحان کو جِلا بخشنے میں کارنیل یونی ورسٹی میں داخلے کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ اس ضمن میں دیویندر اسّر کا کہنا ہے کہ:

”اسی بہانے فرانس، اٹلی، ڈنمارک، جرمنی، سوئٹزر لینڈ، انگلینڈ اور ایران بھی گھوم لیا جس سے میری شخصیت کا پیراڈائم شفٹ ہو گیا“۔۵

اور یوں کمیونزم اور انقلابی ادب کے دلدادہ دیویندر اسّر، اپنی نظریاتی تبدیلی کے باعث رومانس پر مبنی ادب کے گرویدہ ہو گئے۔

**دیویندر اسّر کا تنقیدی سرمایہ:**

بیرونِ ملک قیام نے دیویندر اسّر کے افکار کو جدید ادبی نظریات کے گہرے مطالعے کی بدولت ترقی پسندانہ سوچ کے زیور سے آراستہ کر دیا تھا اسی لیے وطن واپس لوٹتے ہی وہ 'مستقبل کے روبرو' جیسا اہم تنقیدی شاہکار ادبی افق پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے جس کے بعد ان کی شخصیت میں نہاں امتزاجی و انضمامی تنقید نگاری کا پہلو کھل کر سامنے آنے سے وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مشرقی تاریخ و تہذیب، ماضی کی روایات، اپنے ماحول اور اخلاقی اقدار کے مغربی فکری نظریات سے موازنے کے بعد دیویندر اسّر اردو ادبی نظریات کی بے توقیری کے اسباب سے بخوبی آگاہ ہو گئے تھے جس کے بعد ہی وہ تقلیدِ مغرب کی مخالفت میں اردو تنقید کی مغربی نظریاتی فکری حصار سے نجات کے لیے باقاعدہ طور پر متحرک رہنے لگے۔ ان کے نزدیک سماجی انقلاب کے لیے ادب کو بطور ہتھیار استعمال کرنا بھی معیوب عمل تھا۔ دیویندر اسّر کے بقول سماجی انقلاب، ادیبوں کی بجائے پیغمبروں اور مسیحاؤں کا فریضہ رہا ہے یا پھر ہٹلرؔ، سٹالنؔ، ماؤزے تنگؔ، تاناشاہؔ، راجہ رام موہن رائےؔ، ودیکانندؔ اور مہاتما گاندھی جیسے لیڈر رہی اپنی سوچ اور فکر سے یہ

امور بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دیویندر اسّر کے تنقیدی مجموعات پر بحث کا آغاز انور سدید کے ذیل کے بیان سے کیا جاتا ہے:

> ”اردو ادب میں دیویندر اسّر کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر تو افسانہ نگار ہیں لیکن وہ زندگی کو ایک نفسیات داں کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مستقبل کا مشاہدہ ایک سائنسداں کی عینک سے کرتے ہیں۔ چنانچہ انھیں ایک ایسے نقاد کی حیثیت بھی حاصل ہے جو مستقبل کے روبرو کھڑا ہے اور زمانہ حال کے مشاہدات سے مستقبل کے بارے میں گہرے مفکرانہ انداز میں سوچ رہا ہے۔“[٦]

ا۔ ’فکر اور ادب‘:

دیویندر اسّر کا اوّلین تنقیدی مجموعہ ’فکر و ادب‘ مرتبہ ۱۹۵۸ء، دو حصوں ’فکر‘ اور ’ادب‘ پر مشتمل ہے جس میں ’جدید ادبی فکر‘، ’جدید فکر اور ادب‘، ’ادیب کے مسائل‘، ’ادب کے مسائل‘ اور ’تنقید کے مسائل‘ کے پسِ منظر میں متعدد ذیلی عنوانات بشمول ’اظہاریت اور ادب‘، ’افادیت اور ادب‘، ’ٹالسٹائی اور رچرڈز‘، ’مارکسی نظریہ تنقید‘، ’ترقی پسند ادب‘ اور ’ادب اور لاشعور‘ کے علاوہ ’جدید فکری رجحانات‘، ’سرریلزم اور وجودیت‘، ’ادب میں نیا شعور‘، ’ادیب اور ریاست‘، ’ادب اور سرکاری سرپرستی‘، ’ادب جمہوریت، اور آمریت‘، ’ادب اور پروپیگنڈہ‘، ’ادب میں سرد جنگ‘ اور ’ادب میں جمود‘ وغیرہ بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔

’اظہاریت اور ادب‘ پر بحث میں لارڈ برڈلے کے ’فن برائے فن‘ کے نظریے سے متعلق اختلافی رائے میں دیویندر اسّر رقمطراز ہیں کہ مخصوص مقاصد کے حصول کا لبادہ اوڑھے کوئی بھی فن پارہ اپنی قدر و منزلت محدود کرتے ہوئے محض جمالیاتی حظ اور تفریح و لذت کی فراہمی کا آلہ کار بن کر رہ جاتا ہے۔ ان کے خیال میں ادب کے ماضی، حال اور

مستقبل کے سنگم پر پروان چڑھنے والی حقیقی دنیا سے گہرے تعلق کے پسِ منظر میں فن پارے کی ماہیت اور منصبیت کو اک دوسرے سے جدا کرنا، نامناسب روّیہ اس لیے بھی ہے کہ زندگی سے متاثر ہونے والا ادب ہی زندگی کو بھی متاثر کرتا ہے۔ دیویندر اسّر، بریڈلے اور کروچے کے تنقیدی نظریے کے تجزیے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فن کا تعلق بیرونی دنیا کی بجائے انسان کی اندرونی دنیا سے جڑا ہے اس لیے ادبی فن پارہ، انسان کے داخلی عمل پر بحث کا حامل ہونا چاہیے۔ 'افادیت اورادب' میں ٹالسٹائی اور رچرڈز کے نظریۂ فن اور ادب کی افادیت کے ضمن میں مارکسزم کے اثرات، طبقاتی اقدار کے باہمی تصادم کے علاوہ سماجی نصب العین کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے اردو ادب کے ترقی پسندانہ رجحانات زیرِ بحث لا کر دیویندر اسّر ادیب کی توجہ اہم نکتے پر مبذول کرانے میں بھی کامیاب رہے ہیں کہ مغربی ناقدین، ادب کو سماجی نصب العین اور اقدار کا درجہ دیتے ہوئے ادب کی معرفت ہی سماج، معاشرت اورانسان دوستی کے اہم فریضے کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ دیویندر اسّر کو رچرڈز کے فن پارے کی ماہیت کی جانچ پرکھ اور افادی و فنی پہلوؤں میں توازن قائم رکھنے پر زور دینے کے پسِ پردہ، موضوع اور ہیئت و ابلاغ کی اہمیت اجاگر ہوتی دکھائی دی ہے مگر انھیں مارکسی نظریے کے حامیوں کے ہاں ادب کے فنی پہلو کے مقابلے میں افادی پہلو کی اہمیت نمایاں نظر آئی۔ ڈیکارٹ اور مارکس کے خیالات کے پسِ منظر میں مغربی افکار کے حامی ادیبوں کو دیویندر اسّر نے مشورہ دیا ہے کہ حقیقت نگاری اور وسعت نظری کے ساتھ ساتھ وہ سماجی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ دیویندر اسّر حقیقت نگار، فطرت نگار اور رومانیت پرست ادیبوں کی فکر کے ضمن میں رائے زن ہیں کہ منفی سماجی سرگرمیوں کو ہوا دینے والے ان ادیبوں کے ہاں مشاہدے کی کمی سے ان کی ادنیٰ خیال پرستی پر مبنی تخلیقات میں سماجی شعور کی مفقودیت،لاعلمی اور تنگ نظری کے رجحانات نمایاں ہیں۔ 'ادب اور لا شعور' مضمون میں فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کی جانب سے ادب کے داخلی تجزیے کو خارجی تجزیے پر فوقیت دینے کے ضمن میں ان کی رائے ہے کہ سماجی دباؤ کے خوف سے دلی خواہشات کا گلہ گھوٹنے والے ایسے ادیبوں کا نفسیاتی مطالعہ بھی ضروری ہے۔

'جدید فکر و ادب' میں، 'سرریلزم اور وجودیت' کی معرفت مغرب میں پنپنے والے جدید رجحانات کے ضمن میں دیویندر اسّر رائے زن ہیں کہ فرانس میں کافی عرصہ قبل پروان چڑھنے والے جدید نظریے نے ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ تحریک

کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دیویندر اسّر کو مغربی ادیبوں الفریڈ جیری، اپولیئر، اندرے سلومان، پال الیور، اور لوئی اراگاں وغیرہ کے ہاں سرریلسٹ نظریاتی اثرات واضح محسوس ہوئے ہیں۔ ان کے بقول خیالی دنیا میں بسنے والے ادیبوں کے خارجی دنیا سے عدم ربط کے باوجود بھی بعض تخلیقات منظر عام پر آئیں مگر انتہا پرستانہ اور جمالیاتی پہلو سے بیزاری اور یورپی جنگوں سے تباہ حال لوگوں کی ذہنی خجالت کی بدولت سرریلزم کے مقابلے میں 'وجودیت' کو فروغ حاصل ہوا۔ 'مغربی ادب کے نئے شعور' کے تجزیے میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی حدیں انسانی ارتقائی علم سے جوڑتے ہوئے دیویندر اسّر نے ادب و ریاست کے تعلق، حکومتی سرپرستی کے رجحان اور ادب اور پروپیگنڈہ، جیسے اہم موضوعات پر بھی محتاط انداز میں بحث کی ہے۔

مجموعے کے دوسرے حصے 'ادب' میں 'ادیب کے مسائل' اور 'ادیب اور آزادی' کے عنوانات کے پسِ منظر میں ادب کے مسائل کیا ہیں؟ ادیب کن مسائل میں گھِرا ہے؟ نیز ادبی تنقید کے مسائل کا حل کیا ہے؟ اور اسی نوعیت کے اہم سوالات اٹھانے کے بعد دیویندر اسّر نے نکتہ پیش کیا ہے کہ ادیب کے بنیادی مسئلے 'اظہارِ رائے کی آزادی' کو بنیاد بنا کر مغربی مفکّر پیٹرک ہنری فریاد رس رہا ہے کہ 'مجھے آزادی دو، یا مجھے موت دے دو'، لیکن آزادی سے متعلق اصل سوال پھر بھی بر قرار ہے کہ اس آزادی کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ کوئی ادیب، محض اظہارِ رائے کی آزادی کا طالب ہے یا پھر اس آزادی کے پسِ پردہ وہ فکری آزادی کا بھی طلبگار ہے؟ 'ادیب اور ریاست' اور 'ادب اور سرکاری سرپرستی' کے عنوانات پر بحث میں دیویندر اسّر ادیب اور سرکاری سرپرستی کی مخالفت میں کہتے ہیں:

> "ادب کا رشتہ سرکاری سرپرستی یا مادی ترقی سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ بدترین حالات میں بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق ہوئی ہے۔ بلکہ سرکاری سرپرستی اور ادبی ترقی کے تحت ادنیٰ ادب وجود میں آیا ہے۔ ادبی ذوق، سرکاری سرپرستی اور مادی ترقی سے مبرّا ہے۔ جینیس خارجی حالات سے پیدا ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ وہ اپنا خالق خود ہے اس کی تخلیقی قوت

کو بروئے کار لانے کے لیے ایک ہی شرط کافی ہے آزادی۔۔۔۔۔۔ تخلیق کی آزادی۔"ے

دیویندر اسّر اپنے تجزیے میں حق بجانب ہیں کہ ریاست ہمیشہ جمہوریت کے نام پر ادیب کی آزادیٔ فکر سلب کر لیتی ہے جس سے ادب پر سیاست کے منفی اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ 'ادب میں سرد جنگ' کے ضمن میں دیویندر اسّر کی نشاندہی بجا ہے کہ ادبی دنیا کی سرد جنگ کے خاموش کردار، اپنے گروہ اور ذاتی نظریات کی تشہیر میں ادبی یا فنی اقدار کی پیروی کی بجائے اپنے گروہ کے ادیبوں کی ایک عام سی تحریر اوجِ ثریا پر پہنچانے کی تگ و دو کے منفی طرزِ عمل سے وہ اپنے ادیبوں کی موت کا نقارہ بھی بجادیتے ہیں۔ 'ادب میں جمود' کے عنوان پر مبنی مضمون میں ادبی، سماجی اور اقتصادی اسباب کے تجزیے میں دیویندر اسّر کو ادبی جمود و تعطل کا واحد حل، ادیب کی مخصوص فکری تڑپ اور لگن میں دکھائی دیا ہے۔ ان کے خیال میں ماضی میں سماجی اقدار کی نوعیت یکسر مختلف رہی ہے مگر آج کے اقتصادی دور میں صورتحال کے بدل جانے سے ادب کی ترقی و ترویج کے لیے مخصوص ادبی ماحول اجاگر کرنا بھی ضروری ہے۔

دیویندر اسّر کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہمارے ادب پر مختلف نظریات و تحاریک سے تشہیر پانے والے جدید مغربی رجحانات کے اثرات سے تحفظ اور اردو ادب کو درپیش دیگر مشکلات کا واحد حل، ادیب کے مثبت کردار کی صورت نظر آیا ہے۔ ان کے خیال میں ادیب کے مثبت کردار کے ذریعے جدید ترقی یافتہ و مادہ پرستانہ دور میں سائنس، عقل پرستی اور انسانیت کے باہمی تعاون سے ہی ادب و تنقید کی نشوونما ممکن ہے۔ الغرض دیویندر اسّر نے وجودِ فن کے بنیادی اسباب، ادب کی ماہیت و افادیت کے محرکات جیسے اہم نکات زیرِ بحث لاکر 'فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے باہمی فکری اختلافات کو تخلیقی اسباب کے ترازو میں تولنے کی سعی کی ہے۔ بعض ناقدین دیویندر اسّر کا مجموعہ مغربی افکار و نظریات کا چربہ قرار دیتے ہیں تاہم اس ناقدانہ رائے سے بھی دیویندر اسّر کی تنقیدی صفت کا مثبت پہلو نمایاں ہوا ہے کہ وہ مغربی افکار و نظریات کے باقاعدہ مطالعے اور جانچ پرکھ کے بعد ہی اپنا تجزیاتی و تنقیدی ہتھیار استعمال میں لائے ہیں۔

**۲۔ 'ادب اور نفسیات':**

'ادب اور نفسیات' مطبوعہ ۱۹۶۳ء میں نفسیاتی ادب سے متعلق موضوعات 'فرائیڈ اور ادب'، 'ادب پر تحلیلِ نفسی کا اثر'، 'شعور کا بہاؤ'، 'نفسیاتی تنقید'، 'مطالعہ اور نفسیات'، 'سرریلزم: خواب اور حقیقت کا سنگم'، 'تمثیلات اور سمبالسٹ تحریک'، 'لاشعور اور تخلیقی فن' کے علاوہ دیگر اہم موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ مجموعے کے پہلے موضوع 'فرائیڈ اور ادب' کا تعلق براہِ راست پہلے مجموعے کے مضمون 'ادب اور لاشعور' کی بحث سے جڑا ہے جسے پہلے کی مختصر بحث کے بعد دوبارہ حرف و اضافت اور خیالات و افکار کی ترمیم سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیویندر اسّر کا پہلے مجموعے میں 'ادب اور لاشعور' کے تحت فرائیڈین نظریے سے متعلق ذاتی نکتہ نظر یہ تھا کہ "جو ادیب فرائیڈؔ سے متاثر ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر پر، فرائیڈ کے ابتدائی نظریے کا ہی اثر ہے۔" لیکن اس کے برعکس اب یہی نکتہ نظر ترمیمی انداز سے 'فرائیڈ اور ادب' کے عنوان سے ان الفاظ میں پیش ہوا ہے: "فرائیڈ کا نظریہ فن آج پوری طرح قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔" مذکورہ فکری تبدیلی، ایک طرح سے دیویندر اسّر کے تنقیدی شعور کی بالیدگی کی گواہی ہے۔ اسی طرح 'علمِ نفسیات'، 'فرائیڈ کی تحلیل نفسی' اور 'لاشعوری محرکات' جیسے موضوعات پر بھی پہلے مجموعے میں اختصار سے کام لیا گیا تھا تاہم اب یہی موضوعات فکری ترمیم و اضافے سے تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ 'ادب پر تحلیل نفسی کا اثر' کی بحث میں ادب پر فرائیڈؔ کے نظریے کے اثرات کے تجزیے میں دیویندر اسّر رائے زن ہیں کہ "بیشتر ادیبوں نے تحلیلِ نفسی کا اثر، شعوری طور پر قبول کیا تاہم بعض ادیبوں کے ہاں یہ محرکات، دیگر شعرا، ایلٹؔ اور لارنسؔ وغیرہ کی وساطت سے اثر پذیر ہوئے" جس کی تائید ان کے فرائیڈؔ سے متعلق ذیلی بیان سے بخوبی ہو جاتی ہے:

> "فرائیڈ نے ادب سے کافی اثر قبول کیا ہے۔ فرائیڈ نے خود کہا ہے کہ 'مجھ سے پہلے شاعر اور فلسفی لاشعور کو دریافت کر چکے تھے۔ میں نے محض ایسا سائنٹفک طریقہ دریافت کیا ہے جس سے لاشعور کا مطالعہ کیا جا

سکے۔۔'۔ فرائیڈ نے ادب اور فن کے بنیادی محرکات پر۔۔۔ کئی جگہوں پر بحث کی ہے اور کئی فنکاروں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔"۸

اہلِ فلسفہ کے موضوع 'ذہنی عمل' نے دورِ جدید میں مزید اہمیت اختیار کرتے ہوئے مفکرین کو 'لاشعور کے علم' اور اس کی اہمیت کی بحث پر مائل کر لیا۔ مختلف اقوام کے مذہبی، فلسفی اور ادبی مفکرین محسوسات سے ماوراء غیر معمولی قوتوں کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں۔ تاہم ان ماوراء قوتوں کے تصوّرات سے لاشعوری عمل کے تصوّرات یکسر مختلف ہیں جن کی تشکیل میں ماہرین کے بقول غیر آسودہ خواہشات کا بڑا ہاتھ ہے۔ قدیم تصوّرات کے مبلغین اور جدید مفکرین کے گروہ 'لاشعوری عمل' کو جدید ادب و فن کی تخلیق کا بنیادی محرک گردانتے ہیں۔ دیویندر اسّر کے خیال میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترویج پانے والے جدید رجحانات میں شامل مارکس کے نظریات سے دو جداگانہ پہلو نمایاں ہوئے جن میں ایک پہلو اردو ادب کے نوجوان ادیبوں کا اقتصادی و سیاسی گھٹن سے باہر نکالنے میں ممد و معاون ہونے پر اس نظریے میں تسکین و راحت محسوس کرنا ہے، جبکہ دوسرا پہلو، فرائیڈ کے نظریات کے گرویدہ پیروکار ادیبوں کو جنسی آزادی کے حوالے سے سماجی جکڑ اور پابندیوں کے خلاف محاذ آرائی کی جانب مائل کرنا ہے۔ دیویندر اسّر کو جدید دور کے ادیب کی ذہنی لاشعوری قوت اور جدید رجحانات نمایاں کرنے میں فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر وغیرہ کے نظریات کی واضح آمیزش نظر آئی ہے۔ 'شعور کا بہاؤ' سے متعلق ان کا تجزیہ ہے کہ تحلیل نفسی کی حامل 'شعور کی رو' کی تیکنیک میں ادیب اپنے تخلیقی تجربات میں کبھی داخلی کیفیات سے کام لیتا ہے تو کبھی حسیاتی تاثرات سے اپنی فکری کیفیات بیان کر دیتا ہے یا پھر وہ یادداشت کے سہارے ماضی کے جھروکوں میں جھانک لیتا ہے۔

'ادب اور نفسیات' میں دیویندر اسّر نے سماجی، اقتصادی، سیاسی ماحول کے ادب پر اثرات اور ادیب کی ذہنی نشو نما میں انفرادی و اجتماعی شعور کی آمیزش پر تفصیلی بحث کی بجائے اپنی زیادہ تر توجہ فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کے لاشعوری نظریات اور یورپی تحاریک بالخصوص فرانس کی سمبلزم اور سریلزم کی جانب ہی مرکوز رکھی۔ گو کہ مذکورہ تحاریک پر بحث کرنا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ اس سے قبل بھی 'ادب اور نفسیات' کے حوالے سے مغربی تھیوریز، افکار و تصوّرات اور

تحاریک پر متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں تاہم اس موضوع پر دیویندر اسّر کی کاوشوں سے اردو ادب میں اک باقاعدہ مربوط کتاب شاید پہلی بار منظرِ عام پر آئی جو قاری کی نظر میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

**۳۔ 'ادب اور جدید ذہن':**

تیسرا تنقیدی مجموعہ، مطبوعہ ۱۹۶۸ء، جدید تہذیب کے پروردہ ہم عصر ادب کا تجزیہ ہے جس کے ابتدائیے بعنوان 'روبرو' کے بعد دیویندر اسّر 'بیمار تہذیب اور لاچار مسیحا'، 'جدید ادب اور اقدار کا کرائیسس' کے علاوہ دیگر موضوعات 'وجودیت: تنہائی کا دور اور آزادی کا بوجھ'، 'جدید فلسفہ اور ادب'، 'جدید نفسیات اور ادب'، 'جدید ادب کا ذہنی سفر' اور 'منٹو اور انسان کا تصوّر' وغیرہ بھی زیرِ بحث لائے ہیں۔ دیویندر اسّر، ادب و اقدار کو بحرانی سمندر میں ڈبو دینے والی دوسری جنگِ عظیم اور ترقی پسند تحریک کے بعد کی ذہنی و سماجی فضا سے 'جدید ذہن' مراد لیتے ہیں۔ انھوں نے 'بیمار تہذیب اور لاچار مسیحا' مضمون میں جدید معاشرت کو 'بیمار تہذیب' اور مادیت پرست ادیب کو 'لاچار مسیحا' سے منسوب کرتے ہوئے ادیب کی منفی فکری تخلیقات پر تنقید کے پسِ منظر میں، رُو بہ زوال معاشرے کی ادبی، تہذیبی و معاشرتی اقدار کی ترویج کے لیے ادیبوں کی سوچ کے لیے درست سمت کا تعین کیا ہے۔ دیویندر اسّر کے خیال میں انسانی علوم اور نفسیات نے مذہب اور اخلاقیات و اقدار کا تصوّر، کمزور کر دیا ہے اسی لیے آج کا ادیب مثبت سیاسی یا سماجی مقاصد کی تگ و دو کی بجائے معاشرے کے مجرمانہ اور متشدّد افعال کو ادب کا موضوع بنا کر 'بیٹس' کی پیروی میں شہوت انگیز اور اخلاق سوز ادب کے تخلیق عمل کو اہمیت دینے لگا ہے، حالانکہ اجتماعیت کے اندھے پن اور خود پرستانہ لذتیت پر مبنی یہ ادب، دراصل خود سپردگی اور خود فریبی کا دوسرا نام ہے۔

دو حصوں پر مبنی 'جدید ادب اور اقدار کا کرائسس' بھی پہلے مضمون میں اٹھائے گئے نکات کا تسلسل ہے جس کا آغاز، 'نطشے' کے اعلان 'خدا مر گیا (نعوذ باللہ) اور ہم اس کے قاتل ہیں' اور 'بریخت' کے بیان 'انسان مر گیا اور میں اس کا گواہ ہوں' کے بیانات دوھرانے سے ہوا ہے۔ دیویندر اسّر کے خیال میں مذکورہ دونوں بیانات جدید تہذیب سے متعلق دو

بڑے سانحات کا نقارہ ہیں جن میں جدید انسان کی ذہنی تشکیک، تنہائی اور جلاوطنی کے اندھیروں میں ڈوب جانے کا خوف کا چھایا رہا۔ دیویندر اسّر کے بقول تخلیقی اور تخریبی قوتوں کے مابین ہر دور کی باہمی چپقلش کی طرح بیسویں صدی کی ادبی فضامیں بھی یہی چپقلش شدت سے محسوس ہوتی رہی جس کے نتیجے میں تہذیبی اقدار کی بکھری کیفیت کا پہلے سے شکار جدید دور کا ادب اور ادیب دونوں جدید سائنسی ایجادات کے باعث فنا کے خوف سے مزید ذہنی وفکری مرض میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ انسانی شخصیت کی شکست وریخت، سیاسی، عمرانی، خلاقی نظام اور فلسفے کی بدولت مروّجہ بے اطمینان کیفیت سے متعلق مسائل، سماجی اقدار کے گرد گھوم رہے ہیں اسی لیے دیویندر اسّر کے مطابق جدید دور کا انسان، اقدار کے مسائل میں گھرا رہتا ہے اور ساتھ ہی جنگوں اور سیاسی جبر واستبداد سے اپنے خواب چکنا چور ہونے پر مایوس کن صورتحال میں اس کا جسم، ذہن اور روح تینوں مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبے ہیں۔ جدید تہذیب، معاشرے کے افراد کو جسمانی لذت و آسائش تو مہیا کر رہی ہے مگر انسانی روح کے لیے اس دور میں امید کی کرن ناپید ہے اسی لیے انسانی روح اور جسم کے درمیان وسیع خلا پیدا ہو چکا ہے۔ انھوں نے 'وجود کی تلاش' کے عنوان سے مضمون میں اسی خلا کی جانب اشارہ کیا ہے کہ آج کے دور کا انسان اپنی ذات کی تلاش میں 'روح' کی بجائے محض 'وجود' تک محدود ہو کر 'وجودیت' کا پیروکار بن کر رہ گیا جس سے ہمارا ادب بھی مغربی ادب کی پیروی میں مقبول فلسفے 'وجودیت' کی تقلید میں اپنی مقبولیت کے لیے کوشاں رہنے لگا ہے۔ دیویندر اسّر 'کالن ولسن' کے نظریہ وجودیت کے قائل ہو کر خود کو مرض کی تشخیص اور علامات کی ترتیب تک محدود رکھنے کی بجائے 'امکانات' کی جانب بھی اشارہ کرتے نظر آئے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کا مقدر احساسِ شکست سے مغلوب ہونا ہرگز نہیں ہے۔ حالات کا رخ بدل کر مسائل پر قابو پالینے کا طرزِ عمل ہی دراصل 'وجودیت' کے دائرہ کار میں شامل ہے۔[9]

'منٹو اور انسان کا تصوّر' کے عنوان سے مضمون میں دیویندر اسّر منٹو کے متعدد افسانوں کے تجزیے میں ان کی شخصیت پر چڑھا ظاہری بدنامِ زمانہ خول اتار کر اس کی باطنی پاکیزگی، قاری کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ روسی ادب سے متاثر ادبی زندگی کا بطور مترجم آغاز کرنے والے منٹو، جنسی پاکیزگی کے نام پر مروّجہ ریاکاری کے خلاف

جنسی بغاوت پر مجبور ہوئے تھے۔ دیویندر اسّر کے مطابق، منٹو اِک جنس نگار ادیب ہونے کے باوجود بھی بطور حقیقت پرست افسانہ نگار معاشرت کی دبیز تہوں میں نہاں حقیقتوں کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں۔ دیویندر اسّر کے تجزیے کے مطابق:

''منٹو کی عریاں نگاری دراصل موجودہ تہذیب کی پوشیدہ ریاکاری کے خلاف علمِ بغاوت ہے۔'' ۱۰

دیویندر اسّر 'ادب اور جدید ذہن' میں، مغربی افکار، ذہنی خلفشار، عمرانی انتشار، نفسیاتی الجھنوں پر مبنی ادبی مسائل کے انبار اور منٹو کی جنس نگاری کے پسِ پردہ حقیقت پرست افسانہ نگار پر بحث کے پسِ منظر میں، معاشرے کی زوال پذیر اقدار کے مسائل اور ان کے حل کی تلاش میں مصروفِ عمل نظر آئے ہیں۔

**۴۔ 'مستقبل کے روبرو':**

دیویندر اسّر کا چوتھا تنقیدی مجموعہ 'مستقبل کے روبرو' ۱۹۸۶ء میں منصہ شہود پر آیا جس کے اہم مضامین میں 'مستقبل کے روبر'، 'ادب اور انسان کا تصوّر'، 'جدید ادب کا فنی پسِ منظر'، 'حقیقت افسانے کی تلاش میں'، وغیرہ کے علاوہ 'جدیدیت ترقی پسندی اور عصری آگہی'، 'ادب کی تخلیق میں خطرۂ جان بھی ہے اور خطرۂ ایمان بھی'، 'ادب اور سماجی تبدیلی کا عمل' اور '۱۹۸۴: بھیانک مستقبل یا تیسری لہر کا انتظار' پر مبنی موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ 'مستقبل کے رُوبرو' کے مضامین میں دیویندر اسّر نے تجزیہ پیش کیا ہے کہ نیا فن، دنیا کا وہ فن ہے جسے آنکھیں دیکھتی ہیں، دل محسوس کرتا ہے، ذہن اسے جانتا ہے، انسان اس کے خواب دیکھتا ہے، یہی خواب اس کے لیے مستقبل کی پیشن گوئی ثابت ہوا کرتے ہیں۔ ان کے بقول حقائق کے انکشافات پر مبنی ادب کے جملہ مسائل کا محور، جدید رجحانات اور نئی تحریکات ہیں۔ اپنے پہلے کلیدی مضمون 'مستقبل کے روبرو' میں وہ بہتر سے بہتر کی جستجو میں کسی تخلیقی عمل کو وہ حرف آخر ماننے سے یکسر انکاری نظر آئے ہیں:

> ''ادب میں مختلف النوع نظریات اپنی باہمی آمیزش اور آویزش سے اس کی ترویج و اشاعت کا باعث بنتے رہے ہیں اور اس طرح آج بھی ادب کی قوت اسی میں مضمر ہے کہ وہ اپنے قارئین کو زندگی کی رنگارنگ تصویریں مختلف زاویوں سے پیش کرتا رہے، جس کے بغیر نہ فن زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی زندگی کی حیاتیاتی قوت کا نمو ہو سکتا ہے۔''[11]

'ادب اور انسان کا تصوّر' میں دیویندر اسّر ماورائے حقیقت اور تصوّراتی دنیا کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حقیقت سے ماورائے حقیقت کی جانب سفر میں خارج سے داخل کی راہ چلتا تخلیق کار، روحانیت کا قائل ہوتے ہی اپنی شناخت کے مسائل سے بھی دوچار ہو جاتا ہے، تاہم اپنے شعور کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبے رہنے کے باوجود اس کا حقیقی دنیا سے ناطہ استوار رہنا، اس کی ادبی کاوشیں کو ازلی تخلیقات کے درجے پر فائز کر دیتا ہے۔ 'جدید ادب کا فنی پسِ منظر' میں دیویندر اسّر، جدید ادبی تخلیق کے بنیادی عناصر کی تفصیل میں بیان ہے کہ ابتداً حقیقت نگاری ہی افسانہ نگاری کا طرّۂ امتیاز رہا مگر بعد کے افسانوں میں فطرت نگاری، خارجی، سماجی اور معاشرت کے عکاس تصوّراتی عناصر کے مخالفانہ روّیے بھی جدید ادب کی تقویت کا باعث بنے اور ابہام و اشاریت، علامت نگاری، سرریلزم، شعور کے بہاؤ، وجودیت، اینٹی سٹوری اور اینٹی کردار پر مشتمل عناصر، تہذیبی زوال اور احساسِ تنہائی سے جدید ادب کافی حد تک متاثر ہوا۔ دیویندر اسّر کے خیال میں جدیدیت سے متاثرہ ادب نے اپنی معنویت کی مفقودیت اور نصب العین کی موقوفیت سے 'جدیدیت' کے روپ میں باضابطہ تحریک میں ڈھل کر انسانی اقدار کے فقدان اور شدت پسندانہ مزاج کے باعث ادب کو لغویت کے اندھیروں میں ڈبو دیا جس سے افسانوی ادب پر بھی کاری وار ہوا ہے تاہم 'جدیدیت' کی اس لہر سے ہی افسانوی ادب اپنے نئے تجربات اور نئی بصیرت سے بھی مستفید ہوا۔ 'حقیقت افسانے کی تلاش میں' پر مبنی مضمون میں دیویندر اسّر نطشےؔ، کافکاؔ، البسرڈؔ، مارکسؔ کے نظریات اور فرائیڈین نفسیات کے تجزیاتی مطالعے میں نتیجہ اخذ کیا ہے کہ لاشعوری اور ذہنی محرکات کے تناظر میں تیزی سے بدلتے حالات اور ماحول کے باعث چونکہ صنفِ افسانہ، کسی فلسفۂ حیات کو نہ تو مکمل طور پر ہضم کر سکا اور نہ ہی

کسی مفکّر کے خیالات کی تقویت کا باعث بن پایا، نتیجتاً افسانہ نگار، نہ صرف اپنی ذات کی اجنبیت و جلاوطنی کے تصّورات سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے حقیقت پرستی کا دعویدار ہو کر بھی حقیقت سے نگاہیں چرانے لگا بلکہ موت کے ستائشی عمل میں زندگی سے بظاہر حقارت اور اقدار کی مخالفت کے باوجود بھی وہ اقدار کے دائرے میں مقید ہو کر رہ گیا جس سے افسانہ نگار کی غیر جانبدارانہ خیالات پر مبنی تخلیقات بھی محض اس کا واہمہ یا مفروضہ محسوس ہونے لگیں ہیں۔

دیویندر اسّر نے 'مستقبل کے روبرو' میں اٹھائے گئے سوالات سے ادیب اور قاری دونوں کی سوچ متحرک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے مضامین میں انھیں نئے ادبی منظر نامے میں سائنسی اور بصری ایجادات کے رجحانات کے ریلے میں پروان چڑھنے والی اقدار کی جانچ پرکھ، ادیب کے مسائل اورادبی تخلیقات کے مستقبل کی فکر مسلسل لاحق رہی ہے۔ انھیں یہ خدشہ بھی رہا ہے کہ ادبی تخلیقات اور ادیب دونوں کو ماضی کی ادبی روایات کے برعکس کہیں کہیں گھمبیر صورتحال کا سامنانہ کرنا پڑے اور جدید مشینوں کی گھن گرج کے سامنے انسانی مساوات کا خواب ٹوٹ جانے سے کہیں ادیب بھی مشینی پرزہ بن کر ہی نہ رہ جائے۔ مجموعے کے آخری مضمون '۱۹۸۴ء: بھیانک مستقبل یا تیسری لہر کا انتظار' میں دیویندر اسّر نے قاری ادب اور ادیب کے مسائل سے متعلق بحث میں سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ سے جدید تہذیب و معاشرت میں بسنے والے انسان کے اکیسویں صدی میں داخلے کی تیاری کے لیے درپیش ذہنی کشمکش کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔

دیویندر اسّر کا شمار ان گنے چنے ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے سائنسی دور کی نئی ایجادات کے اثرات اور اردو اردو تنقید کے پسِ منظر میں انسان، ادب اور سماج کا باہمی تعلق جانچنے کی کوشش کی ہے تاہم اپنی ذاتی بصیرت، عصری ایجادات کے ادراک اور تنقیدی مہارت کے باوصف اخلاقی اقدار کا بھرم رکھتے ہوئے وہ اپنے خیالات و نظریات سے متعلق ذاتی رائے قاری پر مسلط کرنے سے، خود کو باز رکھنے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

**۵۔ 'ادب کی آبرو':**

ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور ڈاکٹر محمد اجمل کے نام منسوب دیویندر اسّر کے پانچویں تنقیدی مجموعے مطبوعہ ۱۹۹۶ء میں مشرق و مغرب کے ماضی و حال کے فکری نظریات کی جانچ پرکھ میں مشرقی ادب کے لیے مستقبل کی راہیں تلاش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ مجموعے کا آغاز 'نئی صدی کی دہلیز' سے ہوتا ہے جو ایک طرح سے مجموعے کا خلاصہ بھی ہے۔ اگلے مضمون 'ادب کی آبرو' میں ادب سے متعلق متعدد سوالات و شبہات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ دیگر مضامین چار عنوانات 'مابعدِ جدیدیت اور عہدِ مرگ'، 'نظریہ، فن پارہ، تہذیب'، 'میڈیا، کمپیوٹر، کلچر' اور 'آخر ہم ادب کیوں پڑھیں' پر مبنی ہیں جن میں دیویندر اسّر ،نئے نظریات سے چشم پوشی کی بجائے اردو ادب و تنقید کو مغربی ادب کی نوآبادیات بننے سے بچاؤ اور تحفظ کے قائل دکھائی دیے ہیں۔ دیویندر اسّر نے اپنے ادب کی پسماندگی وناقدری کا رونا روتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ دیگر علوم کی حکمرانی تسلیم کرتے ہوئے کہیں ہمارے ادب و تنقید نے محکومی یا نوآبادیاتی حیثیت تو اختیار نہیں کر لی؟ انھوں نے ادب کے دیگر علوم سے متاثر ہونے کا اقرار کرتے ہوئے سوال اٹھایا ہے کہ آیا ادب سے دیگر علوم بھی متاثر ہوئے ہیں یا پھر محض ہمارا تنقیدی ادب ہی متاثر ہوا ہے؟ عالمی ادب، فن، کتاب اور کلچر وغیرہ کی طرح جدید دور کے 'میڈیا اور کمپیوٹر' کے ہاتھوں اردو ادب و تنقید کو درپیش چیلنج بھی دیویندر اسّر کے لیے لمحۂ فکریہ رہے ہیں۔

دیویندر اسّر اردو ادب و تنقید سے متعلق بحث میں مغربی آخذات کے حوالہ جات کے ضمن میں بھی متفکّر رہے ہیں کہ ہمارے ادب میں مغربی ادب کے حوالہ جات کی بھرمار ہے مگر مغربی ادب میں ہمارے ادبی حوالوں کی عدم موجودگی، عالمی ادبی میدان میں ہمارے ادب کی جڑوں کی مفقودیت کا اظہاریہ ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں تاریخ کے خاتمے کے اعلان سے متعلق بحث میں دیویندر اسّر نے تجویز پیش کی ہے کہ ہمارے ادب کو بھی فکر و احساس اور تلاش و جستجو میں انفرادیت اور جداگانہ تنقیدی اصولوں کی تشکیل میں اپنے تخلیقی سرچشموں پر بھی بھروسہ کرنا چاہیے؟ مغرب کی روشن خیالی اور دانشوری سے استفادے کے بعد عصبیت، نسلی و مذہبی تفاخر اور ماضی کی مردہ پرستی سے بچاؤ کی خاطر ہمارے مقامی ادب کے لیے اپنے جداگانہ ذہنی ماحول اور فکری فضا کی بیداری کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ ان کے خیال میں فکر و نظر کی کشمکش کی بدولت انسانی ذہن، اپنے گہرے مشاہدے سے فلسفہ، سائنس، نفسیات، سماجیات و دیگر علوم سے آگہی

حاصل کرلیتا ہے۔ ادب کے دیگر علوم اور دیگر علوم کے ادب سے متاثر ہونے سے متعلق دیویندر اسّر کا خیال ہے کہ فرائیڈؔ نے یونانی ڈراموں کے علاوہ دستوفسکیؔ کے ناولوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مغربی ناقدین سارترؔ کی تحریروں میں بھی وجودیت کا پہلو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب رہے ہیں تاہم ہمارے اردو ادب میں اس زمرے میں کی گئیں کاوشیں ناکافی ہیں۔ البتہ ممتاز شیریں، حسن عسکری، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، جیسے معروف نقادوں نے اتنا ضرور کہا ہے کہ 'سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر یا عصمت کی تخلیقات میں چونکہ دیگر علوم یا مغربی ادب کی بازگشت بظاہر سنائی نہیں دیتی اسی لیے ان کی تخلیقات، ان کی ذاتی ادبی فکر کا ہی ثمر ہیں۔' دیویندر اسّر کے بقول دیگر علوم کو متاثر کرنے کے لیے ہمارے ادیبوں کے فکری خیالات و سماجی تحقیقات کو ماٰخذاتِ اولیٰ کا نہیں تو ثانوی ماٰخذات کا درجہ ضرور ملنا چاہیے۔

دیویندر اسّر کے مطابق اردو ادب میں تاحال 'ساختیات' اور 'پسِ ساختیات' کا دور دورہ ہے حالانکہ 'ساختیات' کا دور گزرے عرصہ بیت چکا ہے جس کے بعد 'پسِ ساختیات' کا دورانیہ اس لیے بھی مختصر ہی رہے گا کہ عالمی تنقیدی منظر نامہ اب 'سپر اسٹرکچرلزم' سے آگے نکل کر 'بی یانڈ سپر اسٹرکچرلزم' اور 'ڈی ڈی کنسٹرکشن' پر بھی کتابیں مرتب کرنے لگا ہے۔ وہ مغربی تنقیدی افکار کے یکسر مخالف نہیں ہیں تاہم اس بات کے حامی ضرور ہیں کہ کوئی بھی فن پارہ، تنقید کے سانچے پر پرکھتے وقت اپنے تہذیبی و روایتی اقدار سے ہرگز جدا تصوّر نہ کیا جائے۔ مجموعے کا آخری مضمون 'ہم ادب کیوں پڑھیں' دیویندر اسّر اور ان کے دوست کے مابین مکالمہ ہے جس میں وہ اپنے دوست کے ادبی مطالعے سے متعلق شکوک و شبہات دور کرتے ہوئے اسے ادب کے مطالعے کی جانب مائل کرلیتے ہیں۔ دیویندر اسّر ادبی مطالعے کے ضمن میں اٹھائے گئے اپنے سوالات کے ازخود جوابات دینے کا آغاز ذیل کے الفاظ سے کرتے ہیں:

> "ابھی بیسویں صدی ختم نہیں ہوئی کہ ادیبوں اور دانشوروں نے ہر فکر، شے
> اور فن کے خاتمے یا موت کا اعلان کر دیا ہے۔ خدا، انسان، مذہب، تاریخ،
> مارکسیت، فن، ادب اور ادیب نابود یا 'پوسٹ' ہو گئے ہیں (احساسِ مرگ

لکھنا اور مستقبل کا) اس عہدِ مرگ میں دنیا کی تاریخ ایک ایسے موڑ پر آگئی ہے جہاں جدیدیت اور مارکسیت اپنی کامرانیوں کے تمام تر دعوؤں کے باوجود شکست وریخت کا شکار ہو چکی ہیں۔ لہٰذا ان کے بعد آنے والے دور کو مابعد جدیدیت کے عہد سے موسوم کیا جانے لگا ہے۔ کیا یہ احساسِ مرگ ایک بھولا ہوا بھیانک خواب بن کر رہ جائے گا یا اپنے گرداب میں سب کچھ بہالے جائیگا؟"۱۲

دیویندر اسّر کے بقول ادب زندگی کا آئینہ اور نقدِ حیات ہونے کے علاوہ سماج کا بہترین ترجمان بھی ہے۔ ادب کے طفیل سماجی شعور کی بیداری نہ صرف انسانی ذہن تبدیل کر دیتی ہے بلکہ اسی سے معاشرتی تہذیب و اقدار میں مثبت سوچ بھی بیدار ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں انسان نے اپنے کلچر اور تہذیبی اقدار سے جدا ہو کر خود کو جدید ٹیکنالوجی، کمیونی کیشن اور میڈیا الیکٹرانک ٹیکنالوجی کا اسیر بنا لیا ہے جس سے مغرب میں بھی سوال اٹھ رہے ہیں کہ حقیقت کے مقابلے میں محض عکس کے دائرے تک محدود ہونے پر ادب کا فریضہ، کہیں تہذیبی اقدار کی ترویج کی بجائے طبع تفنن کا ذریعہ بن کر ہی نہ رہ جائے۔ دیویندر اسّر کے خیال میں ہمیں مشرقی ادب کے معیار کی جانچ پرکھ کے لیے اپنی اقدار، تہذیب، تاریخ، روایات اور مشرقی ماحول کے اشتراک سے اپنا جداگانہ تنقیدی ماڈل مرتب کرنا ہوگا۔ اردو ادب میں تنقیدی صنف کی بے توقیری و بے وقعتی کے ضمن میں ان کا ذاتی نظریہ ہے کہ ہمارے تنقیدی زاویے کی یورپی جکڑ سے آزادی پانے تک مغربی ادب کی نو آبادیاتی ناقدری کے سائے ہمارے ادب کے سر پر منڈلاتے ہی رہیں گے۔ ان کے خیال میں پہلے سے جداگانہ اور وسیع ادبی میدان کی دستیابی کی بدولت اپنے احساسِ کمتری کے تدارک اور اردو ادب کی توقیر میں اضافے کی خاطر ہماری تنقیدی صنف کو مغربی افکار کے سامنے ہمہ وقت سرِ تسلیم خم کرنے کی منفی روایت سے چھٹکارا پانا ہو گا۔ دیویندر اسّر 'ادب کی آبرو' میں ذہنی شعور سے متعلق اہم نکتے پر متفق ہیں کہ ہر صدی اپنے اختتام پر فکر و نظریات کے خاتمے کے اعلان کرتی ہے اور آنے والی نئی صدی اپنے ساتھ نیا شعور اور نیا ذہن لے کر آتی ہے۔

**۶۔ 'نئی صدی اور ادب':**

چار حصوں پر مشتمل چھٹے اور آخری تنقیدی مجموعے 'نئی صدی اور ادب' مطبوعہ ۲۰۰۰ء کے موضوعات میں دیویندر اسّر نے حال اور مستقبل کے چہرے پر گزری صدی کے فکری و نظریاتی اثرات کی تلاش اور ادب، فن، کلچر، معاشرت و معیشت کے بدلتے روّیوں اور ادب پر مستقبل کے جدید رجانات کے ممکنہ اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ مجموعے کا پہلا حصہ 'نئی صدی: تحیّرات' کے عنوان پر مشتمل ہے جبکہ دیگر تین حصے 'ادب: سوالات'، 'مابعد جدیدیت: شبہات' اور 'تخلیق: اثبات' کے عنوانات پر مبنی ہیں۔ مجموعے کے ابتدایئے 'مستقبل سے مکالمہ' میں بیسویں صدی کے اختتامی مسائل کی چھاپ سے انسانی مستقبل کا چہرہ دھندلا جانے کے شکوے کے بعد دیویندر اسّر نے پرانی روایات کے پسِ منظر میں نئے خیالات اور جدت کی نشو و نما کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ وہ مستقبل کے بہترین ادب کی تخلیق کے ضمن میں لازم قرار دیتے ہیں کہ ادب، معاشرت، کلچر، فن اور فلسفہ وغیرہ کو اپنے ماضی کی روایات یقینی طور پر زندہ رکھنا ہوں گی کیونکہ جدت کے جذبے سے سرشار فیوچرسٹک فکر کے لیے بھی پرانی روایات کا لحاظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ 'ذکرِ رفتہ، فکرِ فردا' کی بحث میں وہ انسانی فکر کے ماضی کے مرحلے؛ ایک سال، ایک صدی اور ہزار سال میں تقسیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک سال کے بیت جانے پر انسان گزشتہ برس کے واقعات اور سانحات کی یاد میں مگن رہتا ہے مگر ایک صدی کے بیت جانے پر وہ اپنے اور معاشرتی مسائل کے بارے میں فکر مند ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح عہدِ رفتہ کے ہزار سال پر محیط ہو جانے پر انسانی فکری دائرے کی وسعت، اسے معیشت، معاشرت، کائنات، ارض و سما، مادی و روحانی فکری روّیوں پر نئے زاویے سے فلسفیانہ انداز میں غور و فکر پر مائل کر دیتی ہے کہ وہ بطور انسان کہاں سے آیا تھا اور اب اس کا نیا زاویہ فکر کیا ہونا چاہیے؟ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بیتے زمانے کے دو ہزار سال کے دائرے میں پھیل جانے سے سوچ اور فکر کا زاویہ اک بار پھر سے بدل جاتا ہے جس سے انسان کے ماضی کے جملہ علمی، فکری، تخلیقی اور فلسفیانہ روّیے بھی بدل جاتے ہیں۔ اسی تناظر میں دیویندر اسّر خاصے فکر مند رہے ہیں کہ مستقبل میں موجودہ فکری منظر نامہ از خود تبدیل ہو کر جب عالمی فکری و تنقیدی روّیے بھی بدل دے گا تو پھر نئی صدی میں رونما ہونے والی فکری تبدیلی سے مستقبل کے بارے میں انسانی سوچ کا

زاویہ ٔفکر کیا ہو گا؟ ان کے خیال میں چونکہ محض مسائل کی نشاندہی سے ہی انسان کے بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اسی لیے انسان کو اپنے مسائل کی تشخیص کے علاوہ اپنے حال کی بہتری کے لیے خوش آئندہ تصوّر کی جانب بھی دھیان دینا ہو گا وگرنہ انسانی سوچ و فکر نطشے کی طرح بحرانی کیفیت میں ہی مبتلا رہے گی۔ اسی ضمن میں دیویندر اسّر نے اہلِ فکر کی توجہ ذیل کے نکات کی جانب مبذول کرائی ہے:

> ''ہمیں اس بات کی نشاندہی کرنی پڑے گی کہ بیسویں صدی میں وہ کون سے مسائل تھے جس سے ہمیں دوچار ہونا پڑا۔ یہ مسائل کیوں پیدا ہوئے؟ ان مسائل کی نوعیت کیا تھی؟ مستقبل میں ان مسائل کا کیا اثر پڑے گا؟ کون سے نئے مسائل پیدا ہوں گے یا ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے ذہنی، سماجی، اور تکنیکی طور پر تیار ہیں؟''[۱۳]

دیویندر اسّر نے، تہذیب، تاریخ اور روایتی اقدار میں تغیراتی فکر پر مبنی عمل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مغربیت، جدیدیت و مابعد جدیدیت کے افکار کے زیرِ اثر فرد اور سماج کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی تجویز دی ہے۔ ان کے خیال میں ماضی کی سماجی و ادبی روایات کی ناقدری سے قدیم و جدید تہذیبوں کے مابین تصادم سے انسان کا جھکاؤ، مرکز سے بغاوت کے بعد لامرکزیت کی جانب ہو جانے کا خدشہ بھی موجود ہے۔ دیویندر اسّر کے مطابق جس طرح اک عام انسان سماجی بندھن کی تلاش میں مگن ہے اسی طرح ہر دور کا ادیب و مفکّر بھی اپنی اساس کی جستجو میں سماجی و تاریخی روایات اور اقدار کی جڑیں اپنے ماضی میں تلاش کرنے میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ 'صحیح اور غیر صحیح ادب' کی بحث میں دیویندر اسّر رائے زن ہیں کہ ادبی فکر کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہیں تو ادب کی اہمیت پر سوال اٹھائے جاتے ہیں تو کہیں ادبی نظریات سے وابستگی مشکوک قرار دے کر کتب پر پابندیاں عائد کرتے ہوئے انھیں نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے بلکہ ہمارے ہاں ماضی میں یہ اک عام سی روایت رہی ہے۔ نتیجتاً اجتماعی شعور کے بغیر تفرقات اور اختلافات کی بنیاد پر استوار ادب، عالمی سطح پر پذیرائی حاصل نہ کر پایا۔ 'افسانہ نئی صدی کے تناظر میں' کے عنوان پر بحث میں دیویندر اسّر نے

افسانوی دنیا کی عمارت کی بنیاد کے بارے میں فکر مند ہو کر سوال کیا ہے کہ افسانوی عمارت کی بنیاد حقیقت کے قریب تر ہونی چاہیے یا پھر اسے تصوّراتی افکار پر تعمیر کرنا زیادہ مناسب ہو گا نیز افسانوی ادب کے مستقبل کے لیے کیسا زاویۂ نظر متعین کرنا بہتر رہے گا۔ تیسرے حصے 'مابعد جدیدیت: شبہات' کے موضوعات میں 'مابعد جدیدیت: ثقافتی مکالمہ یا ثقافتی خلفشار'، 'مابعد جدیدیت: مغرب اور مشرق میں مباحثہ' اور 'مابعد جدیدیت: سمٹتا بحث کا' مضامین میں سماج، معاشرت، حیاتِ انسانی کی تشکیلِ نو اور انسانی زندگی کے مسائل کے ادراک و تفہیم کے حوالے سے ادب کے اہمیت اجاگر کرتے ہوئے مستقبل کے تصوّراتی خاکے کی تعبیر و معاشرتی تغیّر میں فرد کے کردار کی اہمیت بھی ثابت ہوئی ہے۔

مجموعے کے آخری حصے 'تخلیق: اثبات'، کے تحت 'پریم چند کو دوبارہ پڑھنے پر' کے حوالے سے مضمون میں دیویندر اسّر وضاحت طلب ہیں کہ کیا پریم چند کے تخلیقاتی مطالعے سے متعلق حوالے بدل گئے ہیں یا پھر پریم چند کی اب محض تاریخی حیثیت ہو کر رہ گئی ہے اور ان کے مقام کا تعین بطور تخلیقی و فکری ادیب ہونا چاہیے یا پھر ان کا شمار بطور سماجی حقیقت نگار یا تجزیہ نگار کیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ ان کے خیال میں پریم چند کی تخلیقات میں پائی جانے والی کمزوریوں کے باوصف ان کی تخلیقات کا مطالعہ اب بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ ان کے خیالات و افکار، کسی فریم میں مقید کیے بغیر ہی قاری کے زیرِ مطالعہ لائے جائیں۔ دیویندر اسّر کے مطابق نو آبادیاتی اور مابعد جدید دور میں ماضی کی تہذیبی کشمکش کے تجزیے پر مبنی پریم چند کا تخلیقی مواد اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اگلے مضمون میں دیویندر اسّر کو قرۃ العین حیدر کے ہاں جلاوطنی اور بے دخلی سے ذہنی بکھراؤ کی کیفیت (Dispora) کا احساس باآسانی اس لیے بھی ہو گیا تھا کہ وہ خود بھی ذہن میں بسی اپنے ماضی کی یادیں بھلانے میں ناکام رہے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے کرداروں کی طرح آباو اجداد کے زمینی مراکز سے جلاوطن ہو کر نئے وطن کے نئے معاشرے اور نئے حالات میں بیگانگی، اجنبیت اور وطن سے جدائی کے کرب کا سامنا کیا ہے۔ ہجرت کا سلسلہ قرۃ العین حیدر اور دیویندر اسّر کی برّصغیر کے مہاجرین کے ہمراہ ہجرت تک محدود نہیں ہے بلکہ تاریخِ عالم کے متعدد افراد، سرحدوں کی جذباتی، سیاسی، نظریاتی اساس پر مبنی تقسیم کے اثرات کا سامنا کرتے رہے

ہیں۔ دیویندر اسّر کا تجزیہ ہے کہ اپنے آبائی مرکز کو مستحکم کرنے کی کوشش میں وہ بطور مہاجر نہ صرف لامرکزیت کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ ہجرت کے باعث اس کی شخصیت اور ذات کے بکھراؤ کی صورتحال بھی سنگین تر ہو جاتی ہے۔

'سعادت حسن منٹو: ایروز کے آئینے میں روح کا عکس' سے متعلق مضمون کے آغاز میں ہی دیویندر اسّر افسانوی کردار 'ایروز' کے آئینے میں منٹوؔ کی ذات کا عکس تلاش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ منٹوؔ بذاتِ خود بھی گلہ مند تھے کہ ادب کا قاری تو انھیں بطور افسانہ نگار تسلیم کرنے پر راضی ہے مگر عدالتیں انھیں بطور فحش نگار اور حکومت انھیں کبھی کمیونسٹ تو کبھی ملک کے بڑے ادیب کے نام سے پکارنے لگی ہے۔ نتیجتاً منٹوؔ اپنی ذات سے متعلق مخمصے میں مبتلا ہو کر دنیا کی اہم اسلامی سلطنت میں اپنے نام، مقام اور مصرف کی تلاش میں سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ دیویندر اسّر کو منٹوؔ کے افسانوی کردار 'ایروز' کی طرح دیگر کرداروں کی بے عمل زندگی اور ذہنی اضطراب کے سبب ان کی شخصیت پر روحانیت کے اثرات بھی نظر آئے ہیں۔ دیویندر اسّر کو اسی بے عمل زندگی کی بو، منٹوؔ کے 'کالی شلوار' افسانے کی نسوانی کردار میں بخوبی محسوس ہوئی ہے جو خود کو ریل گاڑی کا وہ ڈبہ تصور کرتی ہے جسے حالات کے انجن کے دھکے سے اسٹارٹ کرتے ہی لوگ اس کی زندگی کے حالات کا کانٹا بدل کر اسے اپنے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ دیویندر اسّر کے مطابق منٹوؔ نے ان کرداروں کی بے حسی کے خلاف شدید نفرت کے اظہار میں 'ایروز' جیسے آتشیں قوت سے مسلح کردار کو شہوانی قوت کا سمبل بنا کر پیش کیا ہے تاکہ بے حس و بے عمل کرداروں کے پیار، ایثار، آسودگی و قرار سے محروم جذبات شدید نفرت میں بدل کر شہوانی قوت کے خلاف جنگ کے لیے کمربستہ رہیں۔ دیویندر اسّر کو، منٹوؔ کے افسانوی کرداروں کی داستانِ حیات کے پسِ منظر میں انسانی نجات کا واحد حل 'روحانیت' ہی میں نظر آیا جس کی گواہی منٹوؔ بذاتِ خود بھی اپنے ذیل کے بیان میں دے چکے ہیں:

"یقیناً روحانیت مسلّم چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بد کرداروں، قاتلوں اور سفاکوں کی نجات کا راستہ صرف روحانی تعلیم ہے، فسطائی طریق نہیں

ترقی پسند اصول پر ان کو سمجھایا جائے کہ خدا نے انسان کو افضل ترین مقام
بخشا اور اس کو نبیوں کا قائم مقام بنایا ہے۔''۱۴

آخری مضمون 'دیو گندھار سے ناگ دیو کی آخری ملاقات' میں دیوندر ستیارتھی کے معروف کردار 'ناگ دیو' پر اپنے تبصرے کے پسِ منظر میں دیویندر اسّر نے 'دیوندر ستیارتھی' کی کہانیوں کے گنجلک پن اور الجھاؤ پر بھی کھل کر بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں دیوندر ستیارتھی نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے 'ناگ دیو' کردار کا انتخاب کیا تھا لیکن دیویندر اسّر کو عام قاری کی طرح 'ناگ دیو' کے کردار اور دیوندر ستیارتھی کی کہانیوں میں موجود پیچیدگی کا بھرپور احساس ہوا ہے۔ دیوندر ستیارتھی کی نئی کہانیوں کے الجھاؤ اور گنجلک پن کے ضمن میں دیویندر اسّر کا تجزیہ ہے کہ قاری کو دیوندر ستیارتھی کی نئی کہانیوں میں بھی ان کی چالیس سال قبل کی کہانیوں جیسی پیچیدہ صورتحال کا سامنا رہتا ہے جن میں دیوندر ستیارتھی کا وہی پہلے والا پرانا گول مال پایا جاتا ہے اسی لیے ادب کے جمالیاتی نشاط کی عدم موجودگی اور کہانی اور مفاہیم کے گنجلک پن کے باعث ان کہانیوں کی اسطوری دبیز تہیں عبور کرنا، عام قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔

**دیویندر اسّر کا تنقیدی زاویۂ فکر:**

مغربی ادب میں روز افزوں تبدیلی پر مائل جدید فکری و ادبی نظریات میں تین طرح کے میلانات عکس انداز ہوئے ہیں جن میں 'جدیدیت کے تصوّرات کی موجودگی اور تسلسل پر اصرار'، 'مابعد جدیدیت پر مبنی تصوّرات کی تشکیل پر اصرار'، اور 'پیروی مغرب پر مبنی فکری تصوّرات سے مکمل یا مشروط و جزوی انکار'، شامل ہیں۔ تاہم دیویندر اسّر کے تنقیدی رجحان کا جھکاؤ یکطرفہ ہونے کی بجائے مذکورہ میلانات کی انضمامی یا امتزاجی ترکیب کی جانب رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر دیویندر اسّر، یک طرفہ تنقیدی رجحانات اپنانے کی بجائے امتزاجی یا انضمامی تنقید کے قائل رہے ہیں جسے بعض تنقید نگاروں نے متبادل تنقید کا نام بھی دیا ہے اور جس کی بنیاد انتخابیت یا (Eclecticism) پر قائم ہے۔۱۵ دیویندر اسّر اخلاقی و جمالیاتی اقدار کی ترویج اور سائنسی ترقی کے پسِ منظر میں جدید ٹیکنالوجی کے بدلتے میلانات سے متاثرہ ادبی مسائل کی نشاندہی

کرتے ہوئے انسانی فطرت کے ارتقاوبقاپر غور و فکر کے لیے ساز گار ماحول پیدا کرنے کے لیے فکر مند رہے ہیں۔ اسی تناظر میں ہی وہ "Communication" "Mass Media and Development جیسے جدید موضوع پر وہ اپنی اہم کتاب منصہ شہود پر لانے میں کامیاب ہوئے جو اردو ترجمے کے ساتھ، بھارت کی اہم جامعات میں بطور جدید نصاب بھی پڑھائی جاتی رہی ہے۔۱۶ دیویندر اسّر کے تنقیدی مجموعات کا اختصاص، مغربی نظریات کے تنقیدی جائزے، اردو ادبی فن پاروں کے پسِ منظر میں زمانۂ ماضی وحال کی تفتیش اور مستقبل کی فکری عمارت کی تشکیل پر مشتمل ہے۔ تنقیدی حوالے سے ان کی اہم تجویز ہے کہ تنقید نگار کو ماضی کے ادب کا تسلسل بر قرار رکھتے ہوئے اپنے اندر حال کی روح سمو کر مستقبل کی جانب اشارہ کرنے والی اقدار کی تشکیل میں حصہ ڈالنا چاہیے۔ دیویندر اسّر کے نزدیک تنقیدی ذہن کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کا کامل ادراک اس لیے بھی ضروری ہے کہ تینوں زمانوں کے امتزاج سے ہی اعلیٰ پائے کی تخلیقات منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا کرتی ہیں۔ وہ صدیوں پر محیط تخلیقی ادب کے حوالے سے ماضی کی جانب گامزن ہر صدی کے اختتام پر اس کے مروّجہ فکر و نظریات کے یقینی خاتمے اور بعد کی آنے والی صدی کے اپنے لیے نئے شعور اور نئی فکری و ذہنی تشکیل سے متعلق نظریے کے قائل رہے ہیں۔

دیویندر اسّر اردو ادب کی ناقدری اور بے توقیری کے ضمن میں بھی بجا طور پر فکر مند رہے ہیں۔ ان کے خیال میں تنقیدی ادب میں محققین کو مغربی ادب کے متعدد حوالہ جات کا اکثر سامنا رہتا ہے تاہم مغربی ادب میں اردو کے نہ ہونے کے برابر حوالہ جات، ہمارے ادب کی بے توقیری کی واضح مثال ہیں۔ اسی پسِ منظر میں دیویندر اسّر نے، اردو تنقیدی زاویۂ فکر کی یورپ اور مغربی ادب کی نو آبادیاتی فکری جکڑ سے آزادی کا حصول، وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے ادیبوں کو اپنے ادبی و تنقیدی پلیٹ فارم پر یکجا ہونے کی تجویز پیش کی ہے۔ ان کے خیال میں اردو زبان کے الگ جداگانہ اور پہلے سے میّسر وسیع ادبی ماحول کی بدولت، اردو زبان کے احساسِ کمتری کا تدارک آسان تر عمل ہے جس کے لیے اردو تنقید نگار کو مغربی افکار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے مشرقی اقدار، تہذیب، تاریخ و روایات کے پسِ منظر میں اپنے ادبی معیار کی جانچ پرکھ کے لیے جداگانہ تنقیدی ماڈل مرتب کرنا ہوگا۔ دیویندر اسّر کا مغربی فکری حصار سے چھٹکارا پانے

سے متعلق زاویۂ نظریوں بھی بجا ہے کہ انگریزی ادب نے اپنی حکمرانی کے اظہار میں اردو اور دیگر علوم کی اصطلاحات کے غلط تراجم تک مروّج کرنے کی روش اپنائے رکھی ہے جس کا ثبوت، زیرِ نظر مضمون کے آغاز میں درج ڈاکٹر ضیاء الحق یوسفزئی کی جانب سے عربی اصطلاح 'نقد و تنقید' کے انگریزی میں کیے گئے غلط ترجمے سے متعلق بیان سے بھی مل جاتا ہے۔

بحث کا اختتام، امتزاج پسند تنقید نگار دیویندر اسّر کی ادب کے مثبت استعمال سے متعلق اہم تجویز پر کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لیے ادب کو بطور سیڑھی استعمال کرنے کے عادی ادیبوں کو مشورہ دیا ہے کہ انھیں ادب کی اہمیت و طاقت مفلوج کرنے والی منفی راویات پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ادبی تخلیقات کے جمالیاتی و تجرباتی پہلوؤں سے بھرپور استفادے کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے تا کہ ادبی ہتھیار کے مثبت استعمال سے قاری کے لیے نیا لینڈ سکیپ معرضِ وجود میں لا کر انسانیت کی بھرپور طریقے سے مدد کی جاسکے۔

## حوالہ جات


1. پروفیسر یوسفزئی، ضیا الحق؛ ڈاکٹر: عربی ادب میں فنِ تنقید کا تاریخی ارتقاء، مشمولہ 'دریافت'، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ اوّل جون، ۲۰۰۲ء، ص۲۴۶۔
2. کلیم، صدیق: نئی تنقید، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص۶۔
3. اختر؛ سلیم، ڈاکٹر: 'تنقیدی دبستان'، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۲۲۔
4. زیدی، ساجدہ: گریزاں کیفیات کے افسانے؛ عالمی اردو ادب: دیویندر اسّر نمبر، پبلشرز اینڈ ایڈور ٹائزرز، کرشن نگر دہلی، جلد ۱۱، ۱۹۹۵ء، ص۵۷۔
5. اسّر؛ دیویندر: ایک زمانہ بیت گیا؛ چہار سو؛ فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، جلد ۱۵، مئی جون، ۲۰۰۶ء، ص۸۔
6. سدید؛ انور: تبصرہ مشمولہ عالمی اردو ادب: دیویندر اسّر نمبر، ایضاً، ص۲۸۶۔
7. اسّر؛ دیویندر: فکر اور ادب؛ مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دھلی، ۱۹۵۸ء، ص۱۱۸۔
8. ایضاً: 'ادب اور نفسیات'، یونین پریس، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص۱۷۔

9. کومل؛بلراج: تبصرہ، عالمی اردو ادب: دیویندر اسّر نمبر، ایضاً، ص ۲۹۳۔

10. اسّر؛دیویندر: 'ادب اور جدید ذہن'، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دھلی، ۱۹۶۸ءو۱۹۹۶ء، ص ۱۷۶۔

11. ایضاً: 'مستقبل کے روبر'؛ پبلشرز اینڈ ایڈوائزرز، دھلی، ۱۹۸۶، ۱۱۰۰۵۱ء، ص ۹۔

12. ایضاً: 'ادب کی آبرو'، ایضاً، ۱۹۹۶ء، ص ۹۔

13. عراقی؛عمران: 'دیویندر اسّر: مستقبل کے روبرو' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۱۷، ۶ء، ص ۳۹۱۔

14. اسّر؛دیویندر: 'نئی صدی اور ادب'، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۹۔

15. اللہ؛عتیق: متبادل تنقید اور دیویندر اسّر، عالمی اردو ادب: دیویندر اسّر نمبر، ایضاً، ص ۱۵۱۔

16. اسّر؛دیویندر: عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء۔

Reference in Roman:

1. Prof. Yousafzai; Zia Ul Haq; Dr.: Arbi Adab Men Fan-e-Tanqid ka Taarikhi Irtiqa;'Daryaft', National Unviversity of Modern Languages,Islamabad Vol.I, June 2002, Page#246.
2. Kaleem; Siddiq: Nai Tanqid; National Book Foundation, Islamabad, 2007, Page#7
3. Akhtar; Saleem Dr.: Tanqidi Dabistan; Sang-e-Meel Publications Lahore,1977, Page#22.
4. Zaidi Sajida: Gurezan Kefiyyat k Afsaney; Almi Urdu Adab, Devender Issr Number Publishers & Advertizrs, Karshan Niger, Dehli, Vo. 11,1995, Page#57.
5. Issr, Devender: Aek Zamana Beet Gaya; Chahaar Soo,Faizul Islam Printing Press,Rawal-
6. pindi, Vo.15, May-June 2006, Page#07.
7. Sadeed, Anwar:Comments; Aalmi Urdu Adab: Devendr Issr Number, As above, Page#286.
8. Issr;Devendr: Fikr Aor Adab; Maktaba Shahrah, Urdw bazar, Dehli,1958, Page#118.
9. ---"---: Adab Aor Nafsiyyat; Union Press, Dehli, 1963, Page#17.
10. Komal; Bilraaj, Comment; Aalmi urdu Adab:Devender Issr Number, As above, Page#293.
11. Issr;Devendr: Adab Aor Jdeed Zehn; Maktaba Shahrah,Urdu bazar,Dehli,1968,Page#176.
12. ---"---: Mustaqbil K Roo Baroo; Publisers & Advertizers, Dehli,, 11051, 1986, Page#9.

13. ---"---: Adab Ki Aabroo; As above, 1996, Page#9.
14. Iraqi; Imran: Devendr Issr Mustaqbil K Roo Baroo; Educational Publishing House, Delhi,6, 2017, Page, 391.
15. Issr; Devendr: Nai Saddi Aor Adab; Publishers & Advertizers, Karshan Nagar, Dehli,
16. 2000, Page# 179.
17. Ullah; Atiq: Mutabadal Tanqid Aor Devendr Issr; Almi Urdu Adab: Devendr Issr Number, Publishers & Advertizers, Karshan Nagar Delhi, Vol. 11, 1995, Page# 51.
18. Issr; Devender: Awami Zaraiee Iblagh,Tarseel Aor Tameer w Taraqi, Qaoumi Council Baraey Farowgh-e=Urdu Zuban, Nai Dehli, 2002.